

عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی درسیات (ایک جائزہ)

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلانی

مدارس کے نظام تعلیم و تربیت میں نصاب کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور یہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ نصاب تعلیم ہی دراصل تعلیم کے بنیادی مقاصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے اور طلبہ کی تعلیمی زندگی کی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کی آبیاری میں یہ ایک موثر کردار ادا کرتا ہے۔ دوری جانب نصاب تعلیم، مدارس یا تعلیمی اداروں کی امتیازی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے تعلیمی رجحانات اور فکری میلانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے اگر مدارس کے نصاب کو مسلمانوں کی علمی دہچیوں اور تعلیمی ترجیحات کا BEROMETER کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ تعلیم جو ہر دور میں قوموں کی تمدنی و ثقافتی ترقی کے لیے بنیادی وسائل فراہم کرتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں اس کے مفید و موثر ہونے کا بہت کچھ انحصار نصاب پر ہوتا ہے موجودہ دور میں نصاب اور اس کے جائزہ کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ مذہبی و ثقافتی زندگی سے تعلیم کا رشتہ استوار ہونے کے ساتھ معاشی زندگی سے بھی اس کا بہت گہرا تعلق قائم ہو گیا ہے اس سے انکار نہیں کہ یہ تعلق کسی نہ کسی حد تک پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن اس دور میں یہ تعلق جس قدر گہرا اور مستحکم ہو گیا ہے ماضی میں اس کی نظیر ملتی مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم پر غور و خوض میں دہچی کافی بڑھ گئی ہے اور اس میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت پر مباحثہ و مذاکرہ اور مختلف انداز

میں اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

جدید دور کے مدارس کے نصابِ تعلیم یا کسی اور پہلو کا جائزہ لیتے وقت ہندوستانی تاریخ کے اُس دور پر نظر ڈالنا دلچسپی و اہمیت سے خالی نہ ہوگا جب یہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی اور نظامِ تعلیم کو اپنے طور پر چلانے کی انھیں پوری آزادی حاصل تھی، اُس دور کے تعلیمی نظام بالخصوص نصاب کا مطالعہ اس لیے ضروری و اہم ہے کہ موجودہ مدارس کے نصابِ تعلیم میں ترمیم و اصلاح پر بحث کے ضمن میں اکثر یہ خیال پیش کیا جاتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مدارس کا نصابِ تعلیم علومِ نقلیہ و عقلیہ کا جامع تھا یا آج کل کی اصطلاح میں اس میں اسلامی و عصری دونوں قسم کے مضامین شامل تھے۔ اس سیاق میں یہ مطالعہ بہت بر محل ہوگا کہ کیا اُس عہد میں واقعہً باقاعدہ ایک نصابِ تشکیل دیا گیا تھا اور درجات کی حد بندی و مدتِ تعلیم کی تعیین کے ساتھ طلبہ کو بہ یک وقت مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مروجہ نصابِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ میری رائے میں اس کے لیے "نصابِ تعلیم" کی اصطلاح استعمال کرنا درست نہ ہوگا اس لیے کہ اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ حکومت کی مقرر کردہ کوئی کمیٹی یا معاصر علماء کی کوئی مجلسِ تعلیم کے مختلف مراحل متعین کر کے ہر مرحلہ کے لیے کوئی نصابِ تشکیل دیتی تھی اور پھر اسی نصاب کے تحت مدارس یا تدریس کے انفرادی مراکز میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مضامین کی تعیین اور ان کے مباحث کی تحدید نصاب کا لازمی عنصر ہے اور اسے رو بہ عمل لانے کے لیے تعلیم کے مختلف مراحل کی واضح تقسیم، درجات کی حد بندی اور مدتِ تعلیم کی تعیین درکار ہوتی ہے اور یہ چیزیں عہدِ وسطیٰ کے تعلیمی نظام میں مفقود نظر آتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس وقت مدارس کی کثرت کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے تحت درس و تدریس کا معروف طریقہ یہ تھا کہ مختلف علوم و فنون کے لیے انفرادی تدریسی مراکز قائم تھے جہاں اساتذہ فنون اپنی دلچسپی کے خاص مضمون میں درس دیتے تھے اور طلبہ و شائقینِ علم اپنی دلچسپی و رجحان کے مطابق ان کے درس میں یکے بعد دیگرے شریک ہوتے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی (صاحبِ مآثر الکلام)

نے اسی طریقہ تعلیم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ”طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند و ہر جا موافقت دست دہد بر تحصیل مشغول می شوند“ لہٰذا اس طریقہ تعلیم میں تلو درجات کی کوئی واضح تقسیم تھی اور نہ کسی خاص نظام الاوقات کے تحت مدت تعلیم کی تحدید یا مدرسہ اور اس کی عمارت کی قید و بند اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ درس و تدریس کے لیے کوئی باقاعدہ نصاب متعین نہیں کیا جاسکتا تھا، بلکہ درس و تدریس کے لیے ہر مضمون سے متعلق کچھ کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ اس لیے اس عہد کے تعلیمی نظام سے متعلق بحث کے ضمن میں ”نصاب تعلیم“ کے بجائے درسیات کی اصطلاح استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اُس زمانہ کی درسیات کا مطالعہ کرتے وقت ایک اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مدارس یا انفرادی مراکز میں کون کون سے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاصر ماخذ میں مدارس کی تعمیر و مرمت، ان کے تعمیراتی محاسن، انتظام و انصرام کے لیے حکومت کے عطیات اور طلبہ و اساتذہ کے لیے وظائف سے متعلق کافی معلومات دستیاب ہیں۔ لیکن درس و تدریس کے مختلف مراحل اور نصاب تعلیم یا درسیات کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے اور یہ مواد بھی علماء و فضلاء اور صوفیاء و شعرا کے تذکروں میں منتشر یا غیر مرتب انداز میں پھیلا ہوا ہے۔ اس بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے سے جو تصویر ابھرتی ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب و علم معانی منطق و فلسفہ، علم کلام و تصوف، ہیئت و ریاضی اور کیمیا و طب جیسے مضامین کے پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ تفصیلات کی کمی کی وجہ سے قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس زمانہ کے تمام مدارس اور انفرادی مراکز میں ان مضامین کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ عہد سلطنت کے بعض مدارس یا مخصوص ”مدرسہ فیروز شاہی“ کے بارے میں ہی یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، نحو و صرف، معانی و بیان، علم نظر، علم ریاضی، علم طبیعی، علم الہیات، علم طب و خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اُس عہد کی کتابوں میں اہل علم و فن کی تعلیمی زندگی کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہر طالب علم بیک وقت ان تمام مضامین کو پڑھتا

اور ان میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ہی ایسے مضامین (مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، نحو و صرف، زبان و ادب وغیرہ) یا ان سے متعلق کتابیں ہیں جو اکثر علما، فضلا و کی درسیات میں مشترک نظر آتی ہیں۔ باقی دیگر علوم کا سیکھنا اور ان میں مہارت کا حصول شائقین علم کی ذاتی دلچسپی اور انفرادی کوشش پر منحصر ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر عہد سلطنت کے ایک عالم مولانا قاسم دہلوی کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے ہدایہ زردی، کشف و مصابیح کا درس لیا یعنی فقہ، اصول فقہ، تفسیر و حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح اس عہد کے ایک دوسرے عالم (ابو حفص عمر بن اسحاق غزنوی) کے تذکرہ میں اتنا اور اضافہ ہے کہ انھوں نے عوارف المعارف کا بھی درس لیا۔ مزید براں کسی کے بیان میں لغت و معانی کا ذکر ملتا ہے اور بعض کی تعلیمی زندگی میں عقلی علوم سے بھی دلچسپی نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ جن لوگوں کو مختلف علوم و فنون کے سیکھنے کا شوق ہوتا تھا وہ ان کے اساتذہ سے فرداً فرداً استفادہ کرتے تھے۔ ایسے شائقین کے لیے نہ تو مواقع اکتساب کی کمی تھی اور نہ ماہرین فنون کی رہنمائی کوئی مسئلہ تھا۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے اساتذہ سے بھی استفادہ کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ اسے چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ معروف چشتی بزرگ اور فقیہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے مولانا عبدالکریم شروانی اور مولانا خضر الدین ہانسوی سے ہدایہ پڑھی۔ مولانا محی الدین کاشانی سے اصول فقہ کا درس لیا اور بعض دوسری کتابوں کے لیے شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے رجوع کیا۔ اس طریقہ درس کی اس سے زیادہ وضاحت ان کے پیرو مرشد شیخ نظام الدین اولیاء کے تذکرہ میں ملتی ہے۔ انھوں نے مولانا علاء الدین اصولی سے فقہ و اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ شمس الملک سے مقامات حریری (عربی ادب) پڑھی، مولانا کمال الدین زاہد سے مشارق الانوار (حدیث) کا درس لیا۔ تفسیر کشف کے لیے شیخ فرید الدین اودھی شافعی سے رجوع کیا اور عوارف المعارف (تفسیر) کے درس کے لیے شیخ فرید الدین گنج شکر کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ اسی طرح پندرہویں صدی عیسوی کے ایک گجراتی عالم راجہ بن داؤد احمد آبادی کی تعلیمی زندگی کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے محمد بن محمود دمقری حنفی سے صرف و

تو اور منطق و عروض کی تعلیم حاصل کی، مخدوم بن برہان الدین سے علم معانی و بیان سیکھا، علم ہیئت و کلام کے میدان میں محمد بن تاج حنفی سے استفادہ کیا اور مکہ مکرمہ جا کر امام سخاوی سے حدیث کا درس لیا۔ خود درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین دم ۱۱۶۱ھ کے بارے میں یہ تفصیلات دستیاب ہیں کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم سہابی میں اپنے والد ملا قطب الدین سے حاصل کی اور ان کی وفات کے بعد ان کا خاندان جب بکھنوا منتقل ہوا تو اس وقت ان کی عمر ابرس تھی اور وہ شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے۔ یہاں سے قصبہ دیوا جا کر انھوں نے مولانا عبد السلام دیوی سے استفادہ کیا اور پھر جالس میں متعدد کتابیں ملا علی قلی سے پڑھیں، معروف روایت کے مطابق انھوں نے انتہائی کتابوں کے لیے مولانا امان اللہ بنارسی سے رجوع کیا۔ اور صاحب سبحة المرجان کے بیان کے مطابق انھوں نے یہ کتابیں ملا غلام علی نقشبندی سے پڑھیں۔ مزید برآں بعض کتابوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں نے ملا نقشبند گورکھپوری سے علم ہیئت کا رسالہ ”قوشجیہ“ پڑھا اور سلوک و تصوف کے میدان میں وہ شاہ عبدالرزاق بانسوی سے فیض یاب ہوئے۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ درس و تدریس کا یہ طریقہ کسی خاص مضمون تک محدود نہیں تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے باب میں یہی طریقہ اپنایا جاتا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ و تصوف کے ساتھ عقلی علوم کے میدان میں بھی اختصاص پیدا کرنے کے لیے یہی طریقہ رائج تھا۔ علوم عقلیہ کے سلسلے میں یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم سے متعلق درس و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ سلطان سکندر لودھی کے زمانہ (۱۲۸۸-۱۵۱۸ء) سے خاص اس وقت شروع ہوا جب ماہرین معقولات شیخ عبداللہ تلمنی و شیخ عزیز اللہ تلمنی ملتان سے شمالی ہند منتقل ہوئے اور ان علوم کی ترویج میں مصروف ہوئے۔ اس سے آگے یہ تاثر بھی دیا جاتا ہے کہ اس سے قبل اس کی درسیات بہت محدود تھیں، ہندوستان میں نہ تو ان علوم کے ماہرین موجود تھے اور نہ ہی اس میدان میں مہارت یا اختصاص حاصل کرنے کے مواقع دستیاب تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر عبداللہ سکندر لودھی سے قبل کے علماء کی تعلیمی زندگی اور ان کی علمی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس عہد میں بھی ان علوم و فنون کے ماہرین موجود تھے جو درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے

ہوئے تھے۔ دوسری جانب اس میدان میں دلچسپی لینے والوں کی بھی کمی نہ تھی جو ان میں حصول مہارت کے لیے اساتذہ سے استفادہ کے علاوہ ذاتی مطالعہ و مشق کی راہیں بھی اپناتے تھے۔ لاہور میں غزنوی سلطنت کے زمانہ میں (اویں صدی عیسوی) ایک مشہور شاعر مسعود سعد سلمان گزرے ہیں جو عربی، فارسی و ہندوی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے عباسی دور کے ممتاز ہنیت داں البتانی کی مرتب کردہ ترتیج اور کتاب التفہیم کے حوالہ سے اپنے اشعار میں جس باریک بینی و وضاحت سے علم ہنیت کے مسائل بیان کیے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس علم پر ان کی گہری نظر تھی۔ لاہوری ان کا مولد تھا اور وہیں ان کی نشوونما و تربیت ہوئی۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس شہر میں مسلم حکومت کے ابتدائی دور ہی میں علم ہنیت کی تعلیم کے مواقع فراہم تھے۔ اس کے بعد کے دور (تیرہویں تا پندرہویں صدی عیسوی) سے متعلق معاصر مورخین کے بیانات سے یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ معقولات کی مختلف شاخوں میں مہارت رکھنے والے علماء و معتد بہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ضیاء الدین برنی کے بیان کے مطابق سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں منقولات کے ساتھ معقولات کے بھی ایسے ممتاز علماء موجود تھے جن کے ہمسر دوسرے مسلم ملکوں میں ملنے مشکل تھے۔ اس عہد میں علم نجوم، ہنیت، منطق، فلسفہ و طب میں امتیاز پانے والوں میں شرف الدین، بدر الدین دمشقی، صدر الدین دہلوی جوینی طبیب، ضیاء الدین نخشبی اور اعز الدین بدایونی شامل تھے۔ اس سے قبل سلطان جلال الدین خلجی کے دور میں سعد الدین دہلوی منطق و حکمت میں مہارت کی وجہ سے منطق کے لقب سے معروف ہوئے۔ سلطان دہلی میں خاص طور سے محمد بن تغلق کو عقلی علوم میں دلچسپی اور ان کی ترویج کے سلسلہ میں شہرت ملی۔ اس کے معاصر علماء و معقولات میں نجم اشعار، علیم الدین، عضد الدین اور معین الدین عمرانی قابل ذکر ہیں۔ دونوں موخر الذکر اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ ان مضامین کی کتابوں کا درس دیتے تھے اور عضد الدین خود سلطان کے استادوں میں شامل تھے۔ اسی دور میں علم طب کے میدان میں سرگرمی کا یہ عالم تھا کہ صاحب مسالک الابصار کے بیان کے مطابق سیکڑوں ماہرین طب سلطان کے دربار سے منسلک تھے۔ مزید برآں سلطان فیروز شاہ تغلق کا زمانہ عام طور پر فقہی علوم کے غلبہ کے لیے مشہور ہے لیکن اس دور میں بھی عقلی علوم میں

دیکھی اور ان سے متعلق تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس عہد کے بعض مدارس میں منطق، فلسفہ و علم کلام کے شامل ہونے کے واضح ثبوت بھی دستیاب ہیں۔ اس وقت جلال الدین رومی، جلال الدین کرمانی، عزالدین خاں عبدالعزیز دہلوی وغیرہ متعدد علماء موجود تھے جو حکمت و فلسفہ اور علوم طبیعی میں خصوصی درک رکھتے تھے اول الذکر شارح شمسہ شیخ قطب الدین رازی کے شاگردوں میں سے تھے اور درس و تدریس ان کا خاص مشغلہ تھا۔^{۱۱۱} موخر الذکر دونوں علماء نے علم ہنیت کی بعض سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور یہ خود اس میدان میں ان کی دیکھی کا آغاز ہے۔^{۱۱۲} اس پر مزید اضافہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ عہدِ فیروز شاہی میں علم طب میں دیکھی و مہارت رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اس عہد میں متعدد شفا خانوں کا قیام بھی اس فن کی ترویج میں سلطان کی دیکھی کا مظہر ہے۔^{۱۱۳} یہ شفا خانے نہ صرف علاج کی سہولتیں فراہم کرتے تھے بلکہ ان میں طب کی تعلیم و تربیت کے مواقع بھی مہیا تھے ان تمام تفصیلات سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ معقولات کا عام تعلیمی نصاب محض چند کتابوں (قطبی و شرح صحائف) تک محدود سمجھا جاتا ہے علمائے معقولات درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور جن لوگوں کو اس میدان میں اعلیٰ تعلیم کا حصول مطلوب ہوتا تھا وہ ان سے رجوع کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ذاتی مطالعہ و تحقیق بھی جاری رکھتے تھے عہدِ وسطیٰ کی اس روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں ”داشمندزی یا ملائیت کے لیے جن علوم کا پڑھنا ضروری تھا ان کی تحصیل کے بعد اور کبھی اس کے ساتھ ہی بطور اختیاری مضامین کے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق علوم (سائنس) فنون و صناعات (آرٹس) زبانوں (لنگویجز) میں سے جن چیزوں کے پڑھنے کی ضرورت تھی ان کے ماہرین سے عموماً لوگ پڑھتے تھے اور جن کے لیے صرف علمی مشق یا مطالعہ، مزاولت و ممارست کی حاجت تھی لوگ اس میں مشغول ہو جاتے تھے۔^{۱۱۴} ان تمام باتوں سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ علوم نقلیہ ہو یا عقلیہ ہر میدان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اس فن کے استادوں سے استفادہ کا رواج تھا جو الگ الگ حلقہ درس قائم کیے ہوئے تھے درحقیقت مروجہ مضامین میں ایک عام سطح کی تعلیم کے بعد ان میں سے کسی یا کچھ میں مہارت کے حصول کے لیے ذاتی محنت و مشقت

زیادہ کام آتی تھی اس کے لیے نہ تو کوئی متعین نصاب یا منتخب کورس تھا اور نہ مدت اکتساب کی تحدید اور نہ ہی کسی مدرسہ یا ادارہ کی یا بندی تھی۔ قدم و جدید طرز تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے قدیم نظام تعلیم کے اس مزاج و انداز کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے ”قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود کا نام تھا وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا کالج بن جاتا تھا اس کے گرد مستفیدوں کی جماعت کثیر جمع ہو جاتی تھی۔ اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا۔ دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا علمی لکچر ہوتا تھا اس کے حرکات و سکنات، نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے سب خاموش علمی لکچر تھے، استادوں کا سلسلہ، شاگردوں کا سلسلہ در سلسلہ پھیلتا جاتا تھا یہاں تک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج یونیورسٹی یا جامعہ اعظم بن جاتا تھا آج کل لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن اس زمانہ میں شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے..... آج کل کی یونیورسٹیاں یا کالج صرف بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے ذی روح کالج ہر قصبہ، ہر گاؤں اور ہر چھوٹے میں قائم کیے جاسکتے تھے“ ۳۵

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی درسیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھ سب حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ اعلیٰ تعلیم ہم پہنچانے میں علماء کے انفرادی تدریسی مراکز موثر کردار ادا کرتے تھے بلکہ درسی کتب کے انتخاب میں بھی یہی اساتذہ فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ اس زمانہ میں پڑھنے پڑھانے کے لیے مروجہ مضامین کے مباحث کی تعیین کے بجائے ان سے متعلق کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ درسیات کا یہ انتخاب دراصل علماء وقت یا اساتذہ فنون کے ذاتی رجحانات اور ان کی صوابدید پر مبنی ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے انتخاب یا درسیات کی تعیین میں زمانہ و مقام کے اختلاف سے فرق پایا جاتا تھا۔ مزید برآں بعض اوقات علماء کے مختلف حلقوں میں ان کی اپنی دیکھی یا فکری رجحان کے اعتبار سے ایک ہی فن یا مضمون کی الگ الگ کتابیں رائج ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عہد سلطنت میں تفسیری درسیات میں زرخیزی کی تفسیر کشاف کو (اپنے تمام تر قابل اعتراض پہلوؤں کے باوجود) سب سے زیادہ

مقبولیت حاصل تھی لیکن صوفی صفت یا صوفیوں کے حلقے سے تعلق رکھنے والے علماء میں تفسیر مدارک التنزیل (مصنفہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی) زیادہ مقبول تھی تاہم اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کشف بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ ایک معروف صوفی شیخ حسام الدین مانچپوری (م ۷۸۷ھ) قرآن کریم میں مسلسل غور و فکر کرتے رہتے تھے تفسیر مدارک ان کی محبوب تفسیر تھی جو ہر وقت ان کے پاس رہتی تھی جب بھی انھیں کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی تو وہ اس سے رجوع کرتے ۷۸۷ھ مشہور حشیشی بزرگ خواجہ حسین ناگوری (م ۷۸۷ھ) کے روزمرہ کے معمولات میں تفسیر مدارک کا درس شامل تھا۔ انہی کے شاگردوں میں قاضی احمد مجذباں تولوی (م ۷۸۷ھ) تاحیات درس و تدریس میں مصروف رہے۔ وہ روزانہ صبح سے مغرب تک تفسیر مدارک کا درس دیتے تھے جبکہ صبح چاشت سے عصر تک دوسری کتابیں پڑھاتے تھے ۷۸۷ھ انہی کے تذکرہ میں شیخ عبدالحی محمدی دہلوی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ”اس وظیفہ تفسیر مدارک سلوک مشائخ ایشاں است“ (تفسیر مدارک کا درس ان کے مشائخ کے معمولات میں شامل تھا) گریحہ معاصر تذکرہ نگار اور مورخین یہ وضاحت نہیں کرتے کہ صوفیوں کے حلقوں میں تفسیر مدارک کی مقبولیت کی کیا وجہ تھی لیکن بعض دیگر تفاسیر جو اس زمانہ میں صوفیوں کے حلقے میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں ان کے بارے میں یہ واضح طور پر معلوم ہے کہ وہ صوفی نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ اس زمرہ میں تفسیر عرائس البیان فی حقائق القرآن (مصنفہ شیخ ابو محمد رزہان بن ابی النصر) شامل تھی۔ ان مثالوں سے درسیات کے انتخاب میں انفرادی رجحانات و فکری میلانات کا عمل دخل اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ اس وقت کی درسیات پر معاصر علماء یا اساتذہ کے اثرات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعض جدید کتابوں میں عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں نصاب کی جس مرحلہ وارتبیدی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے وہ دراصل بعض علماء کے ذاتی رجحان یا کسی خاص فن میں کچھ استادوں کی خصوصی دلچسپی کا مظہر تھی۔ مسلم عہدِ حکومت کے اولین دور میں مرکزی ایشیاء کے علماء و فقہاء کے زیر اثر اور حکومت کی انتظامی ضروریات کی وجہ سے فقہی علوم کو کافی رواج ملا۔ سکندر رودی کے زمانہ میں بعض علمائے معقولات نے علوم عقلیہ کے میدان میں درس و تدریس پر خاص زور دیا اور اکبر کے دور میں کچھ ایرانی علماء و فضلا کی وجہ سے عقلی علوم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بعد کے زمانہ میں علم حدیث میں دلچسپی رکھنے

والے علماء کے اثر سے اس علم کی اشاعت کا سلسلہ دراز ہوا اور اس فن کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بڑھا۔

عہد زیر بحث کی درسیات کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر مریخی و مہارتی نوعیت کی تھیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے مقصود طلبہ کو مختلف مضامین یا فنون سے متعلق معلومات کا خزانہ بہم پہنچانا نہیں بلکہ اس خزانہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ اسی کے پیش نظر درس و تدریس کے لیے ایسی کتابیں منتخب کی جاتی تھیں جن سے انھیں ذہنی مشق حاصل ہو اور ان کی قوت مطالعہ تیز ہو ان میں اصلاً ایسی صلاحیت و استعداد پر و ان چڑھانا مطلوب تھا کہ اگر وہ مروجہ درسیات کی تکمیل کے بعد کسی مضامین میں مہارت حاصل کرنا یا اختصاص پیدا کرنا چاہیں تو انھیں اپنے مطالعہ و تحقیق کو آگے بڑھانے اور مذکورہ مقصد کی تکمیل میں کوئی دشواری نہ پیش آئے اسی وجہ سے علوم آلیہ (نحو و صرف، زبان و ادب، بلاغت و معانی، بیان و بدیع) کی تحصیل پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور مختلف مضامین کی مجمل و مغلغ اور لغوی و فنی اعتبار سے پیچیدہ کتابیں پسند کی جاتی تھیں۔ تفسیر، فقہ، اصول فقہ و ادب کے لیے بالترتیب کشاف، بدایہ، بزدوی، مقامات حریری جیسی کتابیں اسی نوعیت کی تھیں۔ ان سے طلبہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور دوسروں کے مطالب گرفت کرنے کی لیاقت بخوبی پروان چڑھتی تھیں۔ مزید برآں یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت کی درسیات میں منطق و فلسفہ کی کتابوں کی جو بھر مار تھی اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ اس سے مذکورہ بالا مقصد (سوچنے و سمجھنے کی صلاحیت کی آہاری) کے حصول میں کافی مدد ملتی تھی منطق کا اس میں خاص معاون ہونا بالکل واضح ہے۔ اسی طرح اصول فقہ کے تحت جس انداز سے فقہی مسائل کے استنباط کا طریقہ سکھایا جاتا ہے اور دلائل و براہین کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس علم میں بھی قوت فہم کو تیز کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

درسیات کی تدریسی نوعیت پر ایک اور ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض درسی کتب (بالخصوص مشکل و پیچیدہ) کو بار بار ختم کرنے کی روایت بھی پائی جاتی تھی جیسا کہ متعدد معاصر علماء کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کچھ کے بارے میں یہاں تک صراحت ملتی ہے کہ انھوں نے بعض کتابوں کو چالیس

چالیس مرتبہ ختم کیا۔ مثال کے طور پر عہد اکبری کے ایک عالم شیخ حاتم کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے بلاغت و معانی کی درسیات ”شرح مفتاح العلوم اور مطول کو اول تا آخر چالیس مرتبہ ختم کیا۔“ اسی طرح مفتی جمال الدین دہلوی کی بابت یہ وضاحت ملتی ہے کہ انھوں نے ”عضدی“ (علم کلام کی ایک کتاب) کا چالیس مرتبہ درس لیا۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُس عہد میں درسی کتابوں کو زبانی یاد کرنے کی روایتیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ وضاحت دستیاب نہیں کہ اس سے مقصود قوت حفظ مضبوط کرنا یا کچھ اور تھا، شیخ نظام الدین اولیاء کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے تعلیم کے دوران ”مقامات حریری“ کے چالیس اسباق زبانی یاد کر لیے تھے۔ مسالک الابصار کے بیان کے مطابق محمد بن غفران اور صاحب اخبار الانبیاء و سیر الاولیاء کے بقول اس سلطان کے بعض ہم عصر علماء (مثلاً مولانا حسام الدین ملتانی) کو ہدایہ از برہقی شیخ مبارک ناگوری سے علم قرأت کی مشہور کتاب ”شاطبیہ“ کا حفظ منسوب کیا جاتا ہے۔ بابا داؤد مشکوٰۃ کشمیری مشکوٰۃ کے حافظ ہونے کی وجہ سے اس لقب سے معروف ہوئے۔ عبدالملک عباسی کو صحیح بخاری اور محمد معظم کو تفسیر بیضاوی زبانی یاد تھی۔ شیخ احمد فیاض امیٹھوی اور ملا جیون امیٹھوی کو اکثر کتب متداولہ حفظ کرنے کا امتیاز حاصل تھا۔

آخر میں عہد اسلامی کے ہندوستان کی درسیات سے متعلق ایک اور نکتہ کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی درسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اوقات یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان میں بیرونی علماء ہی کی کتابیں شامل تھیں اور یہ کہ درس نظامی جاری ہونے کے بعد ہی ہندوستانی علماء کی کتابیں مروجہ درسیات کا حصہ بن سکیں۔ یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ درس نظامی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے سے ہندوستانی مصنفین کی بعض کتابیں درسیات میں شامل ہو چکی تھیں۔ مثال کے طور پر حدیث کی درسیات میں مشارق الانوار (مولفہ حسن بن محمد صفغانی لاہوری م ۱۱۵۲ھ) نحو میں الارشاد (قاضی شہاب الدین دولت آبادی م ۱۱۵۲ھ) صرف میں رسالہ عثمانیہ (مولانا فخر الدین زرداری م ۱۱۵۲ھ) اور حکمت میں شمس بازغہ (ملا محمود جونپوری م ۱۱۵۲ھ) کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں ہندوستانی علماء نے مختلف علوم و فنون کی بنیادی کتب یا کلاسیکل متون پر متعدد

شرح و حاشی تیار کیے تھے اور یہ بھی بہت پہلے سے درسیات کا حصہ بن چکے تھے۔
 اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں
 جو کچھ نصابی خاکہ پایا جاتا تھا اس پر کتابی رنگ غالب تھا۔ درسیات کا انتخاب اس طور پر کیا
 جاتا تھا کہ ان کی تکمیل سے مضامین کو گرفت کرنے کی صلاحیت اور مختلف علوم و فنون کی
 کتابیں سمجھنے کی قوت پروان چڑھے۔ ان درسیات یا منتخب کتابوں کو اجتہادی یا تقلیدی
 نصاب کے بیانیہ میں ناپنا صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ افہام و تفہیم کے لیے چاہے ہم ان کے
 لیے ”نصاب“ کا لفظ استعمال کریں لیکن صحیح معنوں میں اس طرح کی کوئی چیز واضح شکل
 میں اس وقت موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے ”نصاب تعلیم“ میں مختلف
 مراحل میں جن تبدیلیوں کے رونما ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کچھ کتابوں کے تغیر و تبدل یا
 بعض مضامین کی درسیات میں کمی بیشی کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ مزید براں معروضات بالا
 کی روشنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے نظام تعلیم کا آج کل کے مدارس اور
 ان کے نصاب تعلیم و طرز تدریس سے موازنہ کرنا درست نہ ہوگا۔ خاص کر دونوں عہد کے
 مزاج و نظام تعلیم میں بن فرق کو ملحوظ رکھے بغیر یہ رائے دینا مناسب نہ ہوگا کہ جس طرح اس
 زمانہ کے نصاب میں مختلف النوع مضامین شامل تھے اسی طرح آج کے مدارس کے
 نصاب میں دینی علوم کے ساتھ سماجی و سائنسی علوم کو شامل کر کے ان اداروں کے فارغین
 کو مختلف علوم و فنون میں جامعیت سے متصف کیا جاسکتا ہے درحقیقت دونوں
 عہد کے تعلیمی نظام کا موازنہ کرتے ہوئے عام طور پر یہ پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ
 عہد وسطیٰ میں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی خاص میعاد یا مدت مقرر نہیں تھی بلکہ علمی ذوق
 و شوق کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر اکتساب علم کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لیے مختلف علوم
 میں مہارت حاصل کرنا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ ایک میدان میں امتیاز پانے کے بعد
 دوسرے میدان میں تنگ و دو شروع ہو جاتی تھی۔ آج کل کی طرح صورت حال یہ نہ
 تھی کہ طالب علم تعلیم کی ایک خاص منزل تک پہنچ کر یا کوئی مقررہ کورس پورا کرنے کے
 بعد معاشرتی ضروریات یا علمی زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر سلسلہ تعلیم منقطع کر دیتا
 تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس زمانہ میں تعلیم سے کسب معاش کا
 تعلق اتنا گہرا نہیں تھا جتنا آج ہے۔ ان سب کے علاوہ یہ بات بھی نظروں سے اوجھل

نہیں ہونی چاہئے کہ عہد وسطیٰ میں مختلف علوم و فنون (یا بالفاظ دیگر قدیم علوم و عصری علوم) کے درس و تدریس کے نظام میں وہ واضح فرق نہیں تھا جو اس وقت پایا جاتا ہے اس لیے ایک ہی نظام کے تحت مختلف علوم و فنون کی تعلیم کا اہتمام کرنا یا علوم نقلیہ و عقلیہ دونوں سلسلوں کو ایک ساتھ جاری رکھنا آسان تھا۔ موجودہ دور میں دینی علوم و عصری علوم کی تعلیم کے نظام اور درس و تدریس کے منہج میں اتنا بُعد پیدا ہو گیا ہے کہ دونوں میں امتزاج کی بات کرنا یا ایک ہی طالب علم سے دونوں میدانوں کو عبور کرنے کی توقع رکھنا نظری و فکری طور پر شاید صحیح سمجھا جائے لیکن علمی طور پر یہ بعد از قیاس معلوم ہوتا ہے الا آنکہ مدارس کا نظام تعلیم نیچے سے اوپر تک بالکل بدل دیا جائے اور جدید طرز پر اس کی پوری طرح اور ہانگ کر دی جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میجر آپریشن میں مدارس کی بنیادی خصوصیات باقی رہ پائیں گی کہ نہیں۔ تجربہ ہی اس کا قطعی فیصلہ کر سکتا ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم کا مقالہ ”عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع“ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، ۱۲/۱ جنوری تا ستمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۸-۵۴۔

۲۔ علامہ علی آزاد بگرامی، آثار انکرام، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۰ء، ص ۲۲۲-۲۲۳۔

۳۔ سیرت فیروز شاہی، نقل ۱۱۱ (مخطوطہ خدابخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ) یونیورسٹی کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) ص ۱۴، ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۵۶۔

۴۔ میر خورشید کرمانی، سیر الاولیاء، موسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۱۵ سید عبدالحی نرہۃ الخواطر، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۳/۲۰۔

۵۔ سیر الاولیاء، ص ۲۱۵، سید عبدالحی، نرہۃ الخواطر، ۲/۹۵-۹۶۔ محمد اسحاق بھٹی، فقہاء ہند، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۴۳/۱-۲۴۶۔

۶۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۹ء، ص ۲/۳-۳، ۷۷، ۷۸، رحمان علی خان تذکرہ علماء ہند، نولکشور، ۱۹۱۲ء، ص ۶۲، نرہۃ الخواطر، ۵/۳۸۲۔

۷۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۳، فقہاء ہند، ۱/۳۹۴-۳۹۵۔

عبدالسلامی کے ہندوستان میں

- ۱۸۰۰ء نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۲۲-۱۲۳، فقہار ہند، ۲۴۳-۲۴۴ء تذکرہ علماء ہند، ص ۶۲
۱۸۰۱ء ولی اللہ، اعضاء الاربعہ، مطبع کارنامہ، لکھنؤ، ۱۲۹۹ھ، ص ۵-۶، غلام علی آزاد بلگرامی
سبحۃ المرجان (تحقیق و تدوین ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی) علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۳۹، مآثر الکرام ص ۲۲،
تذکرہ علماء ہند، ص ۲۴، نزہۃ الخواطر ۲/ ۳۸۳-۳۸۴۔ ۱۸۰۲ء سبحۃ المرجان، ص ۳۹
۱۸۰۳ء مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۴/۳
۱۸۰۴ء اعضاء الاربعہ، ص ۵، مقالات شبلی، ۱۱۵/۳
۱۸۰۵ء بدایونی، ۳۲۳-۳۲۴، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۰۱
۱۸۰۶ء دیوان مسعود سعد سلمان (مرتبہ ناصر میری) چانچانہ قرائن، ایران، خرداد، ۱۳۲۲-۱۳۲۳
شبیر احمد خاں غوری، اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج، معارف ۵/ ۹۱، مئی ۱۹۶۳ء،
۱۸۰۷ء برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۲-۳۵۳
۱۸۰۸ء برنی، ص ۳۶۲-۳۶۳، نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۴-۱۶، ۶۶، N. N. Law, Promotion
Of Learning in India during Muslim Rule, Delhi 1973. P.39
۱۸۰۹ء برنی، ص ۱۹۸، نزہۃ الخواطر ۲/ ۴۸-۴۹
۱۸۱۰ء برنی، ص ۴۶، نیز دیکھئے خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی،
۱۹۸۱ء، ص ۳۲۸-۳۲۹
۱۸۱۱ء شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الانصار، مطبع مجتہائی، ص ۱۳۲، تذکرہ علماء ہند، ص ۲۲
۱۸۱۲ء، فقہار ہند، ۲/ ۳۰-۳۱، مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۲۳ء، ص ۱۵۱-۱۵۲
۱۸۱۳ء شہاب الدین العری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ: آٹو اسپیس) علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۳۲
۱۸۱۴ء نزہۃ الخواطر ۲/ ۴۲-۴۳
۱۸۱۵ء سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۳، نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری، مکتبہ، ۱۹۲۴ء، ۱/ ۳۳
نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۵، ۶۸
۱۸۱۶ء فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۵-۱۶، طبقات اکبری، ۲۴۱/۱
۱۸۱۷ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ۱۴۳/۱
۱۸۱۸ء مقالات شبلی، ۲/ ۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴
۳۳۱

۵۲۷ اخبار الاخیار، ص ۱۷۷، نثر بہ الخواطر، ۳/ ۵۵۔

۵۲۸ اخبار الاخیار، ص ۱۸۵-۱۸۶

۵۲۹ اخبار الاخیار، ص ۱۸۶، تذکرہ علماء ہند، ص ۹

۵۳۰ اخبار الاخیار، ص ۱۸۶

۵۳۱ محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون، القاہرہ، ۱۹۶۲ء، ۳/ ۵۶-۵۸

۵۳۲ سید عبدالحی الحسنی، الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند، ۱۹۵۸ء، ص ۱۷۷، دینی مدارس اور ان کے

مسائل (مقالات - سمینار) جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، ۱۹۹۰ء (مقالہ: دینی مدارس اور جدید طریقہ

تدریس - از مولانا ابوالعرفان ندوی) ص ۸۱-۸۰

۵۳۳ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ۲۹۸/۱-۲۹۹-۳۰۵

۵۳۴ بدایونی، ۳/ ۶۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۷۵

۵۳۵ بدایونی، ۳/ ۷۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۷۷-۷۶

۵۳۶ اخبار الاخیار، ص ۵۵، سیر الاولیاء، ص ۱۱۱

۵۳۷ مسالک الابصار، ص ۳۷، سیر الاولیاء، ص ۲۶۶، اخبار الاخیار، ص ۹۰

۵۳۸ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۷۷

۵۳۹ تذکرہ علماء ہند، ص ۶، نثر بہ الخواطر، ۵/ ۱۳۵-۱۳۶

۵۴۰ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۱۳، نثر بہ الخواطر، ۴/ ۱۸

۵۴۱ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۷۷

۵۴۲ مقالات شبلی، ۳/ ۹۹

۵۴۳ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۷۵، فقہاء ہند، ۱/ ۹۹-۹۷، ۲۰۴-۲۰۵، ۲۲۰-۲۲۱، ۲۷۰، ۲۸۸

۵۴۴۔ الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۱۱، G.D.M. Sufi, Al-Minhaj (The Evolution of Curriculum) Delhi, 1977, P.17

۵۴۵ الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند، ص ۲۰۱، فقہاء ہند، ۱/ ۲۲۰، صوفی، محولاً، ص ۱۱

۵۴۶ اخبار الاخیار، ص ۸۷، سیر الاولیاء، ص ۱۱۱، الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند، ص ۲۰۱

۵۴۷ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۲۱۔ الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۷۷، ص ۲۶۵